بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

"مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے عنوان سے میرے مضامین کے دو مجموعے اس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ اب اسی سلسلہ کا یہ تیسرا مجموعہ شائع کیا جا رہا ہے۔ بظاہر پہلے دونوں مجموعوں سے اس تیسرے مجموعہ کا فاصلہ اتنا زیادہ ہے کہ ایک شخص بادی النظر میں یوں محسوس کریگا کہ میں نے حصہ دوم کی اشاعت کے بعد سے یکایک اپنی پوزیشن بدل دی ہے اور خود اپنی بہت سی کہی ہوئی باتوں کی تردید کرنے لگا ہوں۔ لیکن دراصل ان تینوں مجموعوں میں ایک نصب العین کی طرف تدریجی ارتقاء ہے جسکی توضیح یہاں کر دینا چاہتا ہوں تاکہ ناظرین کو کسی قسم کا خلجان نہ پیش آئے۔

یہ بات تھوڑے غور و تامل سے ہر شخص کی سمجھ میں آسکتی ہے کہ ایک پرانی تحریک کو زوال و انحطاط کے بعد دوبارہ زندہ کرنے کا کام کسی نئی تحریک کی ابتدا کرنے کی بہ نسبت زیادہ دشوار اور زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے۔ نئی تحریک پیش کرنے والے کا راستہ تو بالکل صاف ہوتا ہے۔ اسے صرف ان لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے جو اس تحریک سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ اسکو محض اپنے اصول و مقاصد کی تبلیغ کرنی ہوتی ہے۔ پھر یا تو لوگ اسکی دعوت کو رد کر دیتے ہیں یا قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن جو کسی پرانی تحریک کو زوال و انحطاط کے بعد دوبارہ زندہ کرنا چاہے اسکے لیے صرف یہی ایک کام نہیں ہوتا کہ بیگانوں کے سامنے اپنی دعوت پیش کرے بلکہ اسے یگانوں پر بھی نظر کرنی پڑتی ہے۔ وہ اُن لوگوں کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا جو پہلے سے اس تحریک کیساتھ وابستہ ہیں اور بہرحال بیگانوں کی بہ نسبت اُس سے قریب تر ہیں۔ اسکو سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوتا

ہے کہ انحطاط کا عمل اُنکے اندر کہاں تک ہو چکا ہے اور اصل تحریک کا اثر کس حد تک اُن میں باقی ہے۔ پھر اسے یہ فکر کرنی پڑتی ہے کہ جس حد تک بھی وہ دور نکل گئے ہیں اُس سے آگے نہ جانے پائیں، اور جو کچھ اثر انکے اندر باقی ہے وہ محفوظ رہے۔ اُنکی حیثیت اس تحریک کے حق میں بالکل اُس سرمایہ کی سی ہے جو کسی شخص کے پاس بچا کھچا باقی رہ گیا ہو، اور ظاہر ہے کہ ایک عقلمند آدمی کسی طرح یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ جو کچھ اسکا ہے وہ بھی ہاتھ سے جاتا رہے۔ لہذا اسکے لیے ناگزیر ہوتا ہے کہ اس تحریک کے ساتھ لوگوں کی وابستگی جیسی کچھ بھی سر دست ہے اسکو کم از کم اسی حد پر برقرار رکھنے کی کوشش کرے اور اسکو مزید اضمحلال سے روکے۔ تحفظ کی اس تدبیر میں کسی حد تک کامیاب ہو جانے کے بعد اسکے لیے لازم ہوتا ہے کہ وہ انہیں موجودہ حالت پر بھی ٹھیرنے نہ دے بلکہ اصل تحریک کی طرف انکو کھینچنے کی کوشش کرے اور کسی دوسری چیز کو ان کا نصب العین اور انکی کوششوں کا مرکز و محور نہ بننے دے۔ اتنے مرحلوں سے گذر کر پھر کہیں اسکے لیے دعوتِ عام کا موقع آتا ہے اور وہ اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں سے ایک نئی تحریک پیش کرنے والے کا کام شروع ہوتا ہے۔

چونکہ میرے پیش نظر تحریک اسلامی کا احیاء ہے اسلیے مجھے بھی اُسی تدریج کے ساتھ اپنے مقصد کی طرف پیش قدمی کرنی پڑی ہے جسکی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ "ترجمان القرآن" کی زندگی کے ابتدائی چار سال اس کوشش میں صرف ہوئے کہ مسلمانوں کے مختلف طبقوں میں گمراہی کی جو جو شکلیں پیدا ہو گئی ہیں ان پر گرفت کی جائے اور اسلام سے جو روز افزوں بُعد اُن میں پیدا ہو رہا ہے اسے روکا جائے۔ ابھی یہ کوشش جاری ہی تھی کہ ۱۹۳۷ء میں یکایک یہ خطرہ سامنے آگیا کہ ہندوستان کے مسلمان کہیں اس وطنی قومیت کی تحریک کے شکار نہ ہو جائیں جو آندھی اور طوفان کی طرح ملک پر چھاتی چلی جا رہی تھی۔ یہ ظاہر بات ہے کہ ہم موجودہ ظالمانہ نظام حکومت کے خواہ کتنے ہی مخالف ہوں، اور ہمارے دل میں اسکے پنجے سے نکلنے کی خواہش چاہے کانگریسی حضرات سے بھی بڑھی ہوئی کیوں نہ ہو، مگر ہم کسی طرح بھی یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ جو لوگ اس وقت تک تھوڑے یا بہت اسلام کے حلقۂ اثر میں ہیں اُنکو ہندوستانی قوم پرستی کی تحریک اپنی ربطِ عوام کی تدبیروں سے، اور اپنی واردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم

کے ذریعہ سے، اور اپنے سیاسی و معاشی تفوق کے زور سے اپنے اندر جذب کرے، اور انکے نظریات اور ان کی زندگی کو اتنا متغیر کردے کہ ایک دو پشتوں کے بعد ہندوستان کی آبادی میں اسلام اُتنا ہی اجنبی ہو کر رہ جائے جتنا جاپان یا امریکہ میں ہے۔ اس خطرہ کو اور زیادہ پریشان کن جس چیز نے بنا دیا وہ یہ تھی کہ محض انگریزی اقتدار سے آزاد ہونے کے لالچ میں مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں کا ایک سب سے زیادہ با اثر طبقہ اس وطنی قوم پرستی کی تحریک کا معاون بن گیا اور اس نے انگریز دشمنی کے اندھے جوش میں اس چیز کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کرلیں کہ اس تحریک کا فروغ ہندوستان میں اسلام کے مستقبل پر کس طرح اثر انداز ہوگا۔ لہٰذا اس خطرے کا سدِّ باب کرنے کے لیے میں نے مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ ۳۷ء کے آخر میں اور پھر دوسرا سلسلہ ۳۹ء کے آغاز میں شائع کیا۔ ان دونوں مجموعوں میں میرے پیشِ نظر صرف یہ چیز تھی کہ مسلمان کم از کم اپنی مسلمانیت کے موجودہ مرتبہ سے نیچے نہ جانے پائیں اور اپنے تشخص کو گم نہ کردیں۔ اسی سلسلے میں میں نے انکے اندر اسلامی قومیت کا احساس بیدار کرنے کی کوشش کی، انکو اس جمہوری لادینی نظام حکومت کے نقصانات سے آگاہ کیا جو واحد قومیت کے مفروضہ پر ہندوستان میں قائم کیا جا رہا تھا، ان آئینی تحفظات اور "بنیادی حقوق" کی حقیقت واضح کی جن پر اعتماد کرکے مسلمان اس مہلک جمہوری دستور کے جال میں پھنسنے کے لیے آمادہ ہو رہے تھے، اور انکے سامنے شبہ دارالاسلام کا نصب العین پیش کیا تاکہ کسی نصب العین کے موجود نہ ہونے سے خیالات اور اعمال کی جو پراگندگی انکے اندر پیدا ہوگئی ہے وہ بھی دور ہو اور انکو نظر جمانے کے لیے ایک ایسا مطمحِ نظر بھی مل جائے جو نہ تو اصل اسلامی نصب العین کی سمت سے ہٹا ہوا ہو اور نہ اتنا زیادہ بلند ہو کہ اسکی بلندی کو دیکھ کر انکی ہمتیں پست ہو جائیں۔

اُس وقت چونکہ تحفظ کا کام مقدم تھا اس لیے میں نے آزادی، قومیت، قومی تہذیب، حکومت خود اختیاری، اقلیت اور اکثریت وغیرہ چیزوں کے متعلق رائج الوقت تصورات کے خلاف کچھ کہنے سے قصداً احتراز کیا، اور ان الفاظ کے جو مفہومات ذہنوں میں راسخ تھے انکو جوں کا توں قبول کرکے اسی زبان میں

گفتگو کی جسکو لوگ سمجھ سکتے تھے۔ اسی طرح میں نے مطلوب اصلی سے بحث کرنے کے بجائے حالتِ واقعی تک اپنی بحث کو محدود رکھنا زیادہ مناسب سمجھا تاکہ دونوں چیزوں کو بیک وقت پیش کرنے سے دماغ پراگندہ نہ ہوجائیں اور ایک ہی چھلانگ میں مقصد بعید تک پہنچنے کی کوشش کہیں مقصد قریب کے بھی ہاتھ سے جانے کی موجب نہ بن جائے۔

یہ کام جس غرض کے لیے کیا گیا تھا اللہ کے فضل و کرم سے وہ پچھلے دو تین سال میں حاصل ہو چکی ہے اور اب اس امر کا کوئی خطرہ باقی نہیں ہے کہ ہندوستان کے مسلمان کسی وطنی قومیت میں اپنے آپ کو گم کر دینگے یا اپنے آپ کو کسی ایسے جمہوری نظام میں منتخی کرا لینگے جو واحد قومیت کے مفروضہ پر تعمیر کیا گیا ہو۔ یہ جو کچھ ہوا کسی انسانی کوشش سے نہیں بلکہ محض اللہ کے فضل سے ہوا۔ اُسی کی مہربانی سے متعدد اسباب ایسے پیدا ہوئے جنکی بدولت مسلمان اس خطرے سے بچنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس سلسلہ میں جن جن لوگوں کو اس نے تھوڑی یا بہت خدمت کی توفیق بخشی ان کے لیے فخر کا مقام نہیں بلکہ شکر کا مقام ہے۔

اس مرحلہ کے طے ہو جانے کے بعد اب میرے سامنے دوسرا سوال یہ تھا کہ آیا مسلمانوں کو اُس نتیجہ پر مطمئن ہو جانے دیا جائے جو حاصل ہو چکا ہے یا ان میں مزید بے چینی پیدا کر کے انہیں اسلام کے اصلی نصب العین کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی جائے؟ آیا مسلمانوں کو سیاست و اجتماع کے اپنی غلط تصورات میں مبتلا رہنے دیا جائے جو مغربی جاہلیت سے انہوں نے سیکھے ہیں یا انکے سامنے اسلام کے اجتماعی و سیاسی تصورات کو صرف علمی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ ایک عملی مطمح نظر کی حیثیت سے بھی پیش کر دیا جائے؟ آیا مسلمانوں کو محض اپنی انفرادیت کے سنبھالنے ہی میں لگا رہنے دیا جائے یا انہیں اب یہ بتایا جائے کہ تمہاری انفرادیت مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک عظیم تر مقصد کے لیے مطلوب ہے؟ یہ سوال سامنے آتے ہی میرے ضمیر نے قطعی فیصلہ صادر کیا کہ پہلی شق غلط ہے اور صرف دوسری شق ہی صحیح ہے۔ چنانچہ اگر کوئی دوسرا سبب پیش آتا تب بھی مجھے وہ کام کرنا ہی تھا جو میں نے کیا۔ لیکن بدقسمتی سے اسکے ساتھ دو مزید وجوہ ایسے پیدا ہو گئے جنہوں نے مجھے مجبور کر دیا کہ حصۂ دوم کی اشاعت کو فوراً

ہی بعد ان مضامین کا سلسلہ شروع کردوں جنکا مجموعہ اس وقت ہدیۂ ناظرین کیا جارہا ہے:

پہلی وجہ یہ تھی کہ اس نئی حرکت کے دور میں عامۂ مسلمین کی قیادت و رہنمائی کلیتہً ایک ایسے گروہ کے ہاتھ میں چلی گئی جو دین کے علم و عمل سے بے بہرہ ہے اور محض قوم پرستانہ جذبہ کے تحت اپنی قوم کے دنیوی مفاد کے لیے کام کر رہا ہے۔ دین کا علم رکھنے والا عنصر اس گروہ میں اُتنا بھی نہیں جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے اور اُس قدر قلیل کو بھی کوئی دخل رہنمائی میں حاصل نہیں ہے۔ یہ براہِ راست نتیجہ ہے علماء کرام کی اُس غلط سیاسی روش کا جس پر وہ ابھی تک برابر اصرار کیے چلے جارہے ہیں، اور میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستان میں اس سے پہلے کبھی عام مسلمانوں کا اعتماد علمار دین سے ہٹ کر اس شدت کے ساتھ غیر دیندار اور ناواقفِ دین رہنماؤں پر نہیں جما تھا۔ میرے نزدیک یہ صورت حال اسلام کے لیے وطنی قومیت کی تحریک سے کچھ کم خطرناک نہیں ہے۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علحدہ وجود برقرار رکھا بھی (جیسا کہ ٹرکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں) تو انکے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟ ہیرے نے اگر اپنی جوہریت ہی کھو دی تو پھر جوہری کو اس سے کیا دلچسپی کہ وہ کم بخت پتھر کی صورت میں باقی رہے یا منتشر ہو کر خاک میں رل مل جائے۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ میں نے اس نئی تحریک کے اندر داعیۂ دینی کے بجائے داعیۂ قومی کو بہت زیادہ کارفرما دیکھا۔ اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اسلام اور مسلم قوم پرستی ایک مدت سے خلط ملط ہیں، لیکن قریبی دور میں اس معجون کا اسلامی جزء اتنا کم اور قوم پرستانہ جزء اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس میں نری قوم پرستی ہی قوم پرستی نہ رہ جائے۔ حد یہ ہے کہ ایک بڑے ممتاز لیڈر کو ایک مرتبہ اس امر کی شکایت کرتے ہوئے سُنا گیا کہ بمبئی اور کلکتہ کے دولت مند مسلمان اینگلو انڈین فاحشات کے ہاں جاتے ہیں حالانکہ مسلمان طوائفیں انکی سرپرستی کی زیادہ مستحق ہیں! اس حد کمال کو پہنچ جانے کے بعد اس مسلم قوم پرستی کے ساتھ مزید رواداری برتنا میرے نزدیک گناہِ عظیم ہے۔ یہ ظاہر بات ہے کہ مستحکم جماعتی زندگی پیدا کرنے کے لیے افراد میں بہرحال

کوئی ایک مشترک وفاداری پیدا کرنا کافی ہے، خواہ وہ خدا کی وفاداری ہو یا قوم کی یا وطن کی۔ اس لحاظ سے جن لوگوں کو محض جماعتی استحکام مطلوب ہے اُنکے لیے تو یہ امر کسی تشویش کا موجب نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں میں خدا کے بجائے قوم کی مشترک وفاداری سے یہ مقصد حاصل ہو۔ لیکن ہم خدا پر ایمان رکھنے والوں کو آخر کس زمین میں پناہ اور کس آسمان کے نیچے سر چھپانے کی جگہ ملیگی اگر ہم بھی خدا کے ان بندوں کو خدا کے بجائے کسی اور کی مشترک وفاداری پر مجتمع ہوتے دیکھتے رہیں اور کچھ نہ بولیں۔

یہ ہیں وہ محرکات جنکے تحت اس مجموعہ کے مضامین لکھے گئے ہیں۔ میں نے ان مضامین میں مسلمانوں کی مختلف جماعتوں پر اور کہیں کہیں انکے لیڈروں پر بھی صاف صاف تنقید کی ہے، مگر خدا شاہد ہے کہ کسی شخصیت یا کسی پارٹی سے مجھ کو ذاتی عداوت نہیں ہے۔ میں صرف حق کا دوست اور باطل کا دشمن ہوں۔ جس چیز کو میں نے حق سمجھا ہے اس کے حق ہونے کی دلیل بیان کر دی ہے اور جسے باطل سمجھا ہے اس کے بطلان پر بھی اپنے دلائل بیان کر دیے ہیں۔ اگر کوئی شخص مجھ سے اختلاف رکھتا ہو اور وہ دلیل سے میری رائے کی غلطی واضح کر دے تو میں اپنی ہر رائے واپس لے سکتا ہوں۔ رہے وہ حضرات جو صرف یہ دیکھ کر کہ کچھ اُنکی پارٹی یا اُنکی محبوب شخصیتوں کے خلاف کہا گیا ہے غضبناک ہو جاتے ہیں اور پھر اس سے کچھ بحث نہیں کرتے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ حق ہے یا باطل، تو ایسے لوگوں کی اور اُنکے غیظ و غضب کی مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔ میں نہ اُنکی گالیوں کا جواب دونگا اور نہ اپنے طریقہ ہی سے ہٹونگا۔

ابوالاعلیٰ